انشائے بے خبر

مقدمہ

سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی

ادبی دُنیا۔ ڈگی روڈ۔ علی گڈھ

قیمت: ایک رُوپیہ

انشاے بے خبر

(مقدمہ)

سیّد مرتضیٰ حسینؒ بلگرامی

ملنے کا پتہ

ادبی دُنیا، ڈگی روڈ، علی گڈھ

کتابت --- احمد علی

تعداد --- ایک ہزار

سن --- ۱۹۶۰ء

مطبع --- سود پریس، دلی

قیمت --- ایک روپیہ

ناشر:

ادبی دنیا، ڈگی روڈ، علی گڈھ

فہرست

خواجہ غلام غوث بے خبر

خواجہ حضور اللہ کے بیٹے خواجہ غلام غوث تخلص بے خبر ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ر شوال المکرم ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی۔ آپ کا خاندان علم وفضل میں ممتاز تھا۔ یہ خاندان [لاسہ] تبت اور نیپال کے علاقے سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا، اور بنارس میں آباد ہو گیا۔ بے خبر یہیں سن شعور کو پہنچے، علوم عربی وفارسی کی تکمیل بھی آپ نے بنارس ہی میں کی۔

بے خبر کے خالو سید محمد خاں، لفٹننٹ گورنر صوبہ شمالی ومغربی کے میر منشی تھے۔ جب ۱۸۴۰ء میں ان کو پنشن ملی تو خواجہ صاحب کا تقرر بعمر ۱۹ سال اسی عہدے پر ہوا اور ۴۵ سال (۱۸۸۵ء) تک آپ نے میر منشی کے فرائض انجام دیے۔ اس مدت میں مختلف عنایات وخطابات سے سرفراز ہوتے رہے اور اپنی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں سرکار برطانیہ سے "خان بہادر ذوالقدر" کا خطاب بھی پایا۔

میر منشی کے عہدے کی ذمہ داریوں کے باوجود بے خبر ادبی وعلمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ شعروادب کی اصلاح کا خیال رکھتے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج کا اندازہ کرتے، ——— اور زبان وادب کی قدامت اس نہج پر کرنے کے لئے اپنے ذہن کو تیار کرتے۔ چنانچہ آپ کی شعری صلاحیت ورجحانات کے سلسلے میں غالب نے یہ رائے ظاہر کی تھی:۔ ...... رام پور میں ہی تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز

اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے، خدا تم کو سلامت رکھے ......"

[اردوئے معلی]

بے خبر عمر میں غالب سے چھوٹے تھے، لیکن ذہن رسا پایا تھا۔ اردو کے اچھے مگر کم گو شاعر تھے، ویسے شعر و شاعری کا ذوق کچھ فطری تھا اور کچھ ماحول نے پیدا کر دیا تھا۔ تذکروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۴۶ء سے قبل اُردو نثر کی جانب متوجہ ہو چکے تھے، روش عام سے ہٹ کر نثر کو آسان اور سادہ بنانے میں ان کا ہاتھ ہو یا نہ ہو مگر اس روش کی تبدیلی اور اس کے رواج دینے والوں میں ان کا شمار ضرور ہے۔ ورنہ اردو نثر میں جو سادگی اور پُرکاری آج نظر آ رہی ہے، اگر اس عہد میں تبدیلی کی ابتدا نہ کی جاتی تو ممکن ہے ایک طویل مدت تک اس صنف میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوتی ——— اسی طرح اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں کہ مرزا غالب کی نثری تحریروں سے قبل بے خبر کے جو نثری شہ پارے ملتے ہیں ان سے ان کو تقدم کا شرف حاصل ہے۔ اس کا ...... سبب یہ ہے کہ غالب کی تحریریں بھی اس زمانے سے ملتی ہیں اور ان میں سادگی و پرکاری کا وہی جوہر موجود ہے، القاب و آداب کی بے نیازی کا وہی انداز ہے جو بعد کے خطوط میں ملتا ہے۔ بے خبر نے بھی اپنے خطوط میں یہ التزام رکھا ہے، اس لیے یہ بات طے ہے کہ دونوں کے ذہن نے ایک ساتھ اور ایک وقت میں مروجہ نثر کو تبدیل کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اور عملی قدم اٹھایا۔ ویسے بے خبر پر بیدل اور فارسی شعراء اور اس کے ادب کا بے حد اثر ہے، جس نے زبان کو ثقیل دے دیا ہے، اس کے باوجود ان کی تحریروں میں جا بجا شوخی کی جھلک، قوس قزح کا رنگ، زبان کی فصاحت اور لچک، خیال کی وسعت آفرینی اور انشاء پردازی مکمل صورت میں موجود ہے۔

خود غالب جو ان کے ہم عصر اور دوست تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"......... زمرۂ خواص میں عوام کا شمار نہیں، دو مخلص صادق الولا دیکھے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم......."

اس خط کے لہجے اور انداز سے غالب کے خلوص اور نصح دونوں کا اظہار ہوتا ہے، اس کے ساتھ بے خبر کی علمیت اور ادبی شخصیت میں چار چاند بھی لگ جاتے ہیں، ان کے ادبی مزاج کو سمجھنے، ان کی علمی حیثیت کا اندازہ کرنے اور سماجی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ دراصل زبان کا مسئلہ بڑا نازک ہے، عام بول چال اور تحریر و تقریر کی زبان میں جو فرق ہے، وہی فرق ایک صاحب طرز ادیب اور غیر ادیب میں ہوتا ہے، پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب اسی سوجھ بوجھ سے کام لے جو وقت کا تقاضا ہو ——— لیکن بے خبر نے اپنی بصیرت اور ذہنی ادراک سے زبان کا جائزہ لیا، اقدار کو پرکھا اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ راستے کی ناہمواری کو خیال میں نہ لاتے ہوئے، ادب کی خدمت کی، یہ ایک حوصلہ مندانہ کام تھا جس نے پورے ادب کو متاثر کیا ورنہ میر جیسے آسان اور سہل نگار شاعر کی جو تحریریں ملتی ہیں ان میں کوئی نمونہ اردو خط یا اردو نثر کا نہیں ہے، حتیٰ کہ میر کی آپ بیتی بھی فارسی زبان کی مرہونِ منت ہے۔

انشائے بے خبر، خواجہ غلام غوث بے خبر کے ان خطوط اور مقدمے وغیرہ کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کو لکھے ——— اس مجموعہ میں جو خطوط درج ہیں ان کا انداز نگارش اگرچہ انیسویں صدی کے اول کی نگارشات کی طرح ہے اور اس پر دور سرسید کے پہلے کے مکاتیب و تحریر کا اطلاق ہوتا ہے مگر مجموعی حیثیت سے انشاء پردازی کے نئے اسلوب اور جدید رجحانات کا میلان

بھی ملتا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بے خبر کی مزید تحریریں تلاش کی جائیں، ان کے خطوط کی چھان بین کی جائے، سنہ اور تاریخ کا صحیح تعین کیا جائے، اسی طرح بے خبر کی شعری صلاحیت کو اجاگر کیا جائے، ان کے علمی اور قومی کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے۔

بے خبر کی جملہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:-

خونابۂ جگر	فارسی رقعات و نظم	
فغانِ بے خبر	اردو رقعات و نثر	۱۸۹۱ء سال طبع
رشکِ لعل و گوہر	بقیہ مجموعہ نظم و نثر	۱۹۰۸ء سال طبع

انشائے بے خبر ——— عرصہ سے کمیاب تھی، جناب خواجہ احمد فاروقی کی عنایت سے ایک پرانا اور بوسیدہ نسخہ ملا، جو ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں میری تمنا تھی کہ بے خبر کے کچھ اور خط مل جاتے تو اس مجموعہ میں شامل کر دیتا، جہاں جہاں اس کے متعلق دریافت کر سکتا تھا، گیا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اکبر آباد

۳۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

انشائے بیخبر

کا

دیباچہ

مذاقِ درد کے آشنا جو نوکِ نشتر کو تصورِ مژگاں دلدار کی طرح دل میں ڈوبا رہنا عزیز رکھتے اُس کی علیحدگی پسند نہیں کرتے، لذتِ زخم کے تشنا سا جو آبِ شمشیر کو شربتِ دیدار کے مانند آبِ بقا سمجھ کے ذہنِ تمنا بند نہیں کرتے خوب جانتے ہیں کہ جب آتشِ گل عین بہار میں آشیانے میں آگ لگائے تو بلبل نوحہ سرائی میں مجبور ہے اور جب ساقی بے رحم سرِ محفل صراحی کا خونِ جگر اس کے منھ سے اگلوائے تو نالۂ قلقل کا بلند ہونا ضرور ہے۔ آبشار کا سر جب پتھر سے ٹکرائے تو پھر وہ کیونکر نہ چلّائے، نے کے ناسور سینہ پر جب ناخن زنی ہو تو وہ کس طرح شورِ شیون نہ سنائے، بیمار کراہنے سے باز رہے اس جبر پر اُسے کب اختیار ہے جس کے دل پر چوٹ ہو اس کی زبان فغاں نہ کرے بہت دشوار ہے۔ جب یہاں کا یہی دستور ہے پھر بیخبر کا کیا قصور ہے۔ اگلے فغانوں کے بعد وہ کیونکر فغاں نہ کرتا، کیا چُپ رہ کر دل ہی دل میں گھٹ کر مرتا، مجموعۂ فغاں بیخبر چھپنے کے بعد وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتا فغاں کرتا ہے اور ان اوراق پر اس کی تصویر کھینچتا ہے اگر قضا نے اتنی مہلت دی کہ یہ مجموعہ بھی مجموعہ اول کے حد کو پہنچا تو یہ اُس کا ثانی ہوگا ورنہ یہ بھی اسی میں شامل کر دیا جائے گا، اختتام پر یہ شعر حضرتِ بیدل کا داخل کر دیا جائیگا۔

افسانہا بہ بستن مژگاں تمام شد	کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود

بیخبر

مولینا غلام امام شہیدؒ

قبلہ! میری شوخی دیکھئے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نورافشانی کا معما حل کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھیئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا۔ جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے! اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے! گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھلائے! مگر چونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور کیا کرتا ہوں، دیباچہ بھی لکھ ڈالا۔ وہ اس کے قابل تو کاہے کو ہے۔ آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے۔ جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو۔ یا زربفت کے قبا میں جھینٹ کا حاشیہ لگا ہو۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نومشق لکیریں بنادے۔ سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھ دے۔ مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بدصورت کے مقابلہ میں حسین کے حُسن کو رونق ہوتی ہے۔ شب تار میں شمع کی روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے۔ کھاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے۔ صحرانوردی کے بعد باغ کی سیر کا لطف کہا نہیں جاتا ہے۔ خاطر مشکل پسند پسند کرے۔ تو ہو سکتا ہے۔ بیشک دیکھنے والوں کو اس کی خوبی زیادہ دکھا دے گی۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے۔ اُسے روشنی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوش طالعی ہے

اگر یہ قبول ہو۔ اس کے لئے شرف ہے۔ اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔

نواب مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

حضرت۔ نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کالپی اور لکھنو اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں خود سب کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا، کاتب لکھ رہا ہے۔ میں مقابلہ کرتا ہوں اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ اُدھر کاگشت کا آغاز ہو اِدھر اس مجموعہ کا انجام ہو، میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لئے ان کے حوالے کروں اس وقت بھی مقابلہ میں مصروف ہوں، پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا۔ میاں داد خاں صاحب سیاح ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے، شاید وہاں سے بھی کچھ آ جائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آ دیں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔"

دیگر

جناب عالی۔ میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے اس میں

یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ (موید برہان) تصنیف کیا ہے (قاطع برہان کے جواب میں)، اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے آج تک جواب نہیں۔ کیونکر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترک جواب حضرت کی عادت نہ ہو، جواب عنایت کیجئے مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجئے الحمدللہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی جلد بندھوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کردی اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی انہیں اختیار ہے۔

بیخبر

نواب غلام دستگیر خاں حیدرآبادی

اللہ اللہ ایسے ناپرسی اور ناقدری کے زمانے ہیں کہ آفتاب کو ذرہ، دریا کو قطرہ گل کو خار، اکسیر کو خاک جواہرات کو پتھر موتی کو سیپ سونے کو تانبا چاندی کو پارہ چاند کو تارا کے برابر بھی لوگ نہیں جانتے ایسے جوہر شناس اور قدردان بھی ہیں جو ذرہ کو آفتاب، قطرہ کو دریا خار کو گل خاک کو اکسیر پتھر کو جوہر سیپ کو گوہر تانبا کو سونا پارہ کو چاندی تارہ کو چاند کے مساوی مانتے ہیں۔ سچ ہے ایسے ہی لوگوں سے زمانہ قائم ہے۔ آپ میری اور میری تصنیف کی تعریف فرماتے ہیں، اور میں خجالت سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں حیرت کے دریا میں ڈوبا جاتا ہوں گو کہ میری اس ہیچمدانی پر تو یہ افراطِ قدردانی ہے اگر بفرضِ محال مجھے کچھ آتا ہوتا تو کیا ہوتا، آپ اپنی کثرتِ عنایت سے جو چاہیں فرمائیں میں تو اپنے کو ہیچ سے نسبت دیتے ہوئے بھی شرماتا ہوں اور ڈھونڈھتا ہوں کہ کوئی ایسا لفظ ملے جو ہیچ سے بھی زیادہ ہیچ ہو تو اس سے اپنے کو تعبیر کروں، یہ کیا ارشاد ہوا کہ تم جو اپنے کو فقیر لکھتے ہو اس کو میں تعلی سمجھتا ہوں۔ اس لفظ سے زبانہ تو کوئی انکسار کا لفظ نہیں ہے پھر اس سے تعلی کیوں کر مفہوم ہوتی ہے غالباً الفقر فخری کی طرف خیال جاتا ہوگا وہ اور مقام ہے مجازاً فقیر مفلس اور نادار کو کہتے ہیں، میں اسی معنی پر اپنے کو فقیر لکھا کرتا ہوں نہ اس معنی پر اس سے زیادہ ناداری کیا ہوگی

کہ یہاں کی کوئی چیز اپنی نہیں سب عاریتی ہیں چند روز جو اس مسافر خانہ میں ٹھہرا ہوں میرے پاس ہیں یہاں سے چلا جاؤں گا کسی اور کو مل جائے گی یہاں سے جہاں جاؤں گا وہاں کے لئے کچھ سرمایہ پاس نہیں محض تہیدست پھر مجھ سے زیادہ مفلس کون ہوگا اور کیوں اپنی کو بفقیر نہ کہوں جن عنایت فرمانے فغاں بیجگر کو لوگوں کے کانوں تک پہنچایا تھا اب انھوں نے خونابہ جگر کو رنگ طبع دیا جو میرے فارسی نظم و نثر کے مجموعہ کا نام ہے چونکہ ہفتہ عشرہ میں تمام ہو جانے والا تھا میں نے عنایت صحیفہ کے جواب عرض کرنے میں اس کے تمام ہونیکا انتظار کیا چنانچہ وہ اختتام کو پہنچا اور آج اس کی ایک جلد خدمت عالی میں روانہ کی کہ میری نادانی کے دو گواہ آپ کے حضور میں پہنچیں اور اس کی تصدیق کامل ہو جائے ایک کی سیر سے تو آپ تضیع اوقات کر چکے اب اس کو ملاحظہ فرماکر یہ زبان پر لایئے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

مولوی محمد روح اللہ منصف بسولی

اتنی مدت میں ملا مجھ سے وہ دھوکھا دیکر یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

اللہ اکبر اتنی مدت میں آپ نے مجھے یاد کیا کہ میں اس راہ و رسم ہی کو بھول گیا تھا خط جو آیا تو دیر تک حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا کہ کس کا خط ہے اور کاتب اس کے کون بزرگ ہیں جب کچھ خیال میں نہ آیا تو فہرست اسماء احباب میں جو صفحۂ دل پر لکھی ہوئی ہے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے آپ کا اسم گرامی نکلا اس کے پڑھنے نے دل کے ساتھ وہ کام کیا جو اعجاز عیسیٰ مردہ کے ساتھ کرتا تھا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ آپ کا خط ہے عقل نے کہا خدا خدا کرو انھوں نے کبھی اور بھی لکھا ہے کہ اب لکھنے۔ کئی دفعہ رد و بدل کرنے کے بعد میں نے خط کھول ڈالا جب کھولا تو یہ کھلا کہ آپ ہی بر سر لطف و احسان آئے ہیں اب تک سوچتا تھا کہ شکریہ کیسے لکھوں آپ کو جنھوں نے ایک عمر کے بعد یاد فرمایا یا فرزند دلبند

حافظ خواجہ احمد حسین کو جو باعث اس یاد آوری کا ہوا آخر رائے نے اس پر قرار پکڑی کہ بجوں سے شکر گذاری ہی کیا آپ ہی کا پاس ادا کروں کہ وہ آیندہ کے لئے بھی کام آئے گا یاد آوری کے استحقاق کی بنا کو قائم کرے گا جو نعمت ایک عمر کے بعد ملے اس کے شکر ادا کرنے کو بھی ایک عمر چاہیئے وہ کہاں سے ہاتھ آئے اس لئے اعتراف عجز سے اس مرحلہ کو طے کرتا ہوں، درحقیقت میں اس کا ممنون ہوں کہ میری جگہ آپ کے دل میں تھی جو آخر کار اس نے مجھے یاد دلایا اگر نہ ہوتی تو کیوں یاد آتا، فرزند عزیز کے وہاں جانے سے جہاں آپ ہیں مجھے بڑی تقویت ہوئی یقین ہے کہ آپ کسی طرح مجھ سے کم اس کے ساتھ محبت نہ کریں گے، خدا کرے اب آپ مجھے بھول نہ جائیں اور کبھی کبھی تو یاد فرمائیں۔

مولوی ولی محمد وکیل منصفی شاہ آباد

از حالِ دل ندانم آگہ کہ کرد اُو را ۔۔۔ من خود نہ رفتم آنجا فریاد رفتہ باشد

فریاد رس حقیقی کا شکر ہے کہ فغان بیخبر کی خبر آپ تک پہنچی اور اس کے سننے اور خونابہ جگر کے رنگ دیکھنے کا آپ کو ایسا شوق ہوا کہ ایک عمر کے بھولے ہوؤں کو آپ نے یاد کیا میں تو جانتا تھا ؎

کون سنتا ہے فغانِ بیخبر ۔۔۔ دیکھتا ہے کون خونابِ جگر

مگر معلوم ہوا کہ نہیں ابھی گوش شنوا اور دیدۂ بینا باقی ہیں کل ایک ایک نسخہ دونوں کا روانہ کیا ہے صرف پہنچ جانے کی اطلاع چاہتا ہوں اس غرض سے کہ ڈاک میں تلف ہونے کا کھٹکا دل سے جاتا رہے۔

منشی امین الدین خاں

لطف فرمائیے۔ الطاف نامہ کے پہنچنے نے مجھ کو ممنون افراط محبت اد

دل کو سرشارِ بادۂ مسرت کیا آپ نے جو ایک قطعہ کے معنی پوچھے ہیں، پہلے یہ سُن لیجیے کہ تصوف کے جاننے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنھوں نے اس علم کی کتابیں دیکھی ہیں۔ صوفیوں کی صحبت میں رہے ہیں، اس کے مصطلحات اور محاورات اور نکات اور دقائق سے ظاہری واقفیت رکھتے ہیں لیکن ان کا باطن اس کی کیفیت سے تکیف نہیں ہوتا۔ یہ اگر کچھ بیان کریں تو بقدر اپنی معلومات کے بیان کرسکتے ہیں گو وہ چنداں بے ٹھور ٹھکانے نہ ہو مگر غلطی سے پاک بھی نہ ہوگا، اور عالم بے عمل کے وعظ کی طرح ان کے بیان میں اثر اور کیفیت نہ ہوگی، دوسرے وہ ہیں جن کے باطن کو اس سے تعلق ہے اس مسلک کے سالک اور اس منزل کے واصل ہیں ان کا کیا کہنا، وہ جو لفظ منھ سے نکالیں گے گوہر بحر تحقیق ہوگا، جو حرف زبان پر لائیں گے ایک دفتر معارف اور تدقیق ہوگا، ان کے صرف بیان میں وہ اثر ہوگا کہ سننے والے مدہوش ہوجائیں، ہر چند علم ظاہری نہ رکھتے ہوں، ان کا حال مولانائے معنوی کے اس قال کا مصداق ہوگا ؎

گر کنی خدمت نخوانی یک کتیب | علم ہائے نادرہ یابی زجیب

فرقۂ اول کا کہنا نرا قال ہے اور دوسرے فرقہ کا سربسر حال، وہ پرانی کہانی کہتے ہیں یہ اپنی سرگذشت بیان کرتے ہیں، اہلِ مذاق اس کو سمجھتے ہیں کہ دونو میں کتنا فرق ہے ایک تیسرا گروہ اور ہے ان دونوں سے علیحدہ، وہ وہ ہیں جن کو نہ اس علم سے ظاہری تعلق ہے نہ باطنی، اس کی بعض باتیں کہیں سن لی ہیں یا کہیں کوئی مضمون شعر میں دیکھ لیا ہے۔ مقلدانہ کبھی کچھ کہہ اٹھے یا شعر میں باندھ بیٹھے نہ ان کا بیان ٹھیک ہوگا نہ کلام با قاعدہ اس قطعہ میں جس کو آپ پوچھتے ہیں ؎

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی | رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات | عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

عجب خلط مبحث ہے، پہلے شعر کا تو یہ مطلب ہے کہ سلوک میں جب جیسی واردات طاری ہو تو ویسا برتاؤ برتے کیفیت سُکر میں ہو تو سجدہ بیخودی میں سر پائے خم پر رکھ دے اور حالتِ صحو میں ہو تو مناجات کرنے کو رُو بہ سوئے قبلہ ہو بیٹھے یہ متعلق بسالک ہے۔ اور دوسرے شعر کے یہ معنی ہیں کہ تغیر صفات میں بھی ناظر جلوۂ ذات رہے تشبیہہ جو نقاب اور حجاب شاہد تنزیہ ہے اُسے نظارۂ ذات سے مانع نہ ہو، ہر صورت میں وہی حسن ہر ذرہ میں وہی چمک دیکھے زبانِ حال سے یہ پکارے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ در پوش　　که من آں جلوۂ قدمی شناسم

اور یہ متعلق بہ عارف ہے پہلے شعر کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے کچھ تعلق نہیں اور تقریر کے مساعدنہ ہوتے سے مطلب کا خبط ہوجانا مزید برآں دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی بندش نے اور بھی معنی کو ژولیدہ کر دیا ہے اُسے جو یوں کہا ہے۔ یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات۔ یوں کہنا تھا "پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو" دونوں شعروں کو باہم ربط تو اس سے بھی نہ ہوتا مگر دوسرے شعر کے معنی صاف ہوجاتے۔ مقلدانہ اور لاعلمانہ کلام اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اس کی شرح میں فکر کرے غور و خوض کے لائق محققین کا کلام ہوتا ہے یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شاعر ہو وہ صوفی بھی ہو۔

محسن الدولہ محسن الملک نواب مہدی علی خاں بہادر منیر نواز جنگ

مخدوم، دو چار ہی دن ہوئے کہ میں نے کچھ اپنے تردداتِ کے بیان میں ایک خط آپ کو لکھا تھا کل برخوردار خواجہ محمد جان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ پر بھی ان دنوں اپنے والد ماجد کے انتقال کا سخت حادثہ گذرا تعجب ہے کہ ممتاز علی خاں صاحب نے مجھے نہ لکھا مجھے بھی اس واقعہ کا نہایت رنج ہوا آپ کو جس قدر ہو

کم ہے، اس میں شک نہیں کہ والدین کا سایہ ظلِ ہما سے بڑھ کر ہے مگر جب دنیا خود ہی سایہ کی طرح گذران ہو، تو اس کی کس کس بات کا رنج کیا جائے ان کے خوش قسمت ہونے میں کچھ شک نہیں جتنے دنوں جیئے عزت و آبرو عیش و آرام میں بسر کی مرے تو آپ سا یادگار چھوڑا کہ جو فخر خاندان بلکہ فخر ہندوستان ہے، خدا ان کو مغفرت کرے اور آپ کو صبر و استقامت عطا فرمائے، اور آپ سے اُن کے نام کو روشن رکھے۔

مولوی محمد حامد

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است ‎ ‎ ‎ ‎ زعشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

اس وقت آپ کے اشتیاق نامے نے مجھے سخت متحیر کیا اللہ اکبر یہ اشتیاق کہ ایک عرصہ سے اُس کا ہونا اظہار کیا جاتا ہے، اور یہ گریز کہ ایک شہر میں رہ کر ملنا تو درکنار یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا حال مجھ پر ظاہر ہو، خدا کیجئے یہ بھی کوئی بات ہے، آیئے اور ملئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کا اشتیاق سچا نہیں ہے۔ ذوق کے اس شعر کے معنی جو آپ پوچھتے ہیں ؎

ہیں آئینہ میں صورت تصویرِ آئینہ ‎ ‎ ‎ ‎ آئینہ رُو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

یہاں صورت کے معنی لغوی یعنی نقش اور پیکر یا مجازی یعنی چہرہ اور عکس مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی اصطلاحی سے مراد ہے یعنی طرح اور کیفیت اور حالت اور وضع اور شکل وغیرہ، صورت کو ان معنوں میں اساتذۂ عجم نے بھی مستعمل کیا ہے چنانچہ حسرتی لکھتا ہے ؎

من چو دیدم صورتت رفتم ز دست ‎ ‎ ‎ ‎ دیگراں را تا چہ صورت داد دست

اے تاچہ حالت قبول ؎

چو دیدا بروانِ ترا گفت مانی ‎ ‎ ‎ ‎ کشیدن کمانِ تو صورت ندارد

یعنی امکان ندارد قدسی ؎

قضا زپایۂ قدرِ تو صورتے برداشت　　زمانہ نام نہاد ش سپہر کیوانی

یعنی طرح برداشت اور اُردو میں اصطلاحی معنی میں یہ لفظ بہت کثرت سے آیا ہو
مثلاً کسی صورت سے یہاں لے آؤ کوئی صورت ملنے کی بتاؤ، آسمان کی صورت
گردش میں ہے، مُردہ کی صورت پڑا ہوا تھا علیٰ ہذا القیاس۔ اس شعر میں صورت
بمعنی مثل ہے اور لفظ میں آئینہ سے متعلق نہیں ہے یعنی یہ غرض نہیں ہے کہ آئینہ
میں ہیں بلکہ آخر شعر میں جو لفظ ہم ہے اس سے متعلق ہے یعنی ہم ہیں اور تصویر آئینہ
سے مقصود وہ تصویر نہیں ہے جو آئینہ کے پیچھے کے تختہ یا ٹین پر بنی ہوئی ہے
جیساکہ آپ سے بھٹنے والے صاحب کا قول ہے اس کو تو تصویر پشت آئینہ کہتے ہیں۔
اور نہ اس سے مُراد ہے جو کاغذ وغیرہ پر کھینچ کر آئینہ کے نیچے رکھ دیتے ہیں جیساکہ
آپ سمجھے ہیں، اُس تصویر کو تصویر آئینہ نہیں کہتے بلکہ اس آئینہ کو جو تصویر کے اوپر
ہو آئینہ تصویر نما یا آئینہ تمثال دار کہتے ہیں۔ تصویر آئینہ وہی تصویر ہے جو سطح آئینہ
پر کھنچی ہوتی ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہو کہ جس طرح تصویر تصویر آئینہ آئینہ کے اندر متحیر ہوتی
ہے جو اس کے سکوت سے ثابت ہو اسی طرح اس آئینہ رو کے سامنے ہم حیران ہیں
یعنی حیرت میں ہیں اور آئینہ کے ساتھ صورت اور تصویر اور رُو اور حیرانی ملائن الفاظ
مناسب کا لانا شاعر کا حُسن بیان ہے۔ اور اگر مذاقِ تصوف کے موافق اس کے
معنی کیجئے تو شاعر نے مقام قرب کو بیان کیا ہے اور وہ مقام متلزم حیرت ہے
اور معشوق کو آئینہ رُو کہتے ہیں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ جب کوئی آئینہ کے سامنے
ہو تو اسے اس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے عاشق کو جب مرتبہ قرب کا حاصل ہوتا
ہو تو دوئی کا پردہ اُٹھ جاتا ہو اور وہ کیفیت حاصل ہوتی ہو جس کو حضرت مرزا بیدل نے فرمایا ہو ؎

شب کہ آئینہ آں آئینہ رو گردیدم　　جلوۂ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اور حیرت چھا جاتی ہے اور یوں کہیئے "من تو شدم یا تو من شدی مضمون واحد ہے،
ہاں صاحب آپنے یہ القاب ہادی مراحل خدا شناسی جامع علوم ظاہری و باطنی مجھے
کیسا لکھا مجھے اس القاب سے کیا مناسبت میری صورت میری وضع میری معاشرت
میری حالت سب اس کے خلاف خدا شناسی اسی کا نام ہے جو میرا حال ہے تو بقول
حضرت مولوی معنوی -

گر ولی ایں است لعنت بر ولی

آئندہ ایسے القاب سے معاف کیا جاؤں اگر رند لاابالی گرفتار ہوا و ہوس حریص دنیا
وغیرہ لکھیئے تو مناسب حال ہے -

حکیم محمد شفیع صفی پوری

اجی حضرت عید ملنے آیا ہوں اٹھیئے اور ملیئے ؎

سخت میخواہم کہ در آغوش تنگ آرم ترا — ہر قدر بفشردہ دل را بیفشارم ترا

آپ فرمائیں گے کہ عید تیجے ترکیسی یہ بات نہیں ہی عید کی نماز یعنی رمضان شریف کے
بخیر سدھارنے کا صلوٰۃ الحمد پڑھ کے جو پڑا تو ضعف صوم سے کئی دن بے ہوش پڑا
رہا پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا بہت جلدی کی دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج
پہنچا ورنہ اپنا تو ناتوانی سے بقول یادش بخیر بخبر یہ حال ہے ؎

در ادل بہار روم گر لبوئے باغ — از ضعف تا رسم بدر آں خزاں رسد

خیر یہ باتیں تو جانے دیجیئے سویاں منگوایئے یا اسے بھی افطاری کی طرح ملنے لینے کا
ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے آپ کو ٹالنا خوب آتا ہی، لایئے عطر و پان ہی عنایت
کیجیئے میں اب رخصت ہوتا ہوں آپ سے تو یہ بھی امید نہیں ہے کہ بازدید کو تشریف
لائیے گا آپ کو راجاؤں سے کہاں فرصت ملتی ہو کر غریبوں کی طرف توجہ فرمایئے گا۔

محب

خدا کے فضل سے یوسف لقا تو ہو صاحب
اب اور چاہیئے کیا ہو پیمبری ہو جائے

خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں محبوب صورت مرغوب سیرت حسن شمائل پسندیدہ خصائل فہم رسا ذہن و ذکا عقل سلیم طبیعت مستقیم علم مفید بخت سعید تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت اخلاق تام قبولیت عام صولت ثروت قدرت حکومت نیک نامی کا شہرہ شاد کامی کا بہرہ عزت کی دولت دولت کی عزت سب کچھ دیا ہے۔ سویدا کی صورت جگہ ہر ایک دل میں ہے نور کی طرح مقام آنکھوں کے تل میں ہے جیسے دیکھو دامن کی وضع پاؤں پر سر جھکائے ہوئے جس پر نظر کرو رکاب کی مثال قدم آنکھوں سے لگائے ہوئے خواص کو یہ تمنا کہ طرہ کے مانند سر پر چڑھ جائے عوام کی یہ خواہش کہ خاک راہگذار کی شکل سواری کے نیچے بس جائے عطر کے مشابہ جس بزم میں آئے مہک اٹھے آفتاب کے مثال جس طرف رخ کیا چمک اٹھے جس مکان میں تم نہیں وہ چمن بے لالہ و گل ہے جو محفل تم سے خالی ہو وہ انجمن بے شمع و گل ہے اور اسی طرح ذکر تمہارا زبانوں پر جاری خون کے ہمرنگ محبت تمہاری رگ جان میں ساری کانوں کو تمہاری آواز کی وہ آرزو جو قلقل مینا کی میخواروں کو یا اذان صبح کی شب بیداروں کو آنکھوں کو تمہارے دیدار کی وہ جستجو جو لقاءِ خوباں کی عاشق مزاجوں کو یا عید کے چاند کی روزہ داروں کو رعب کی یہ حالت کہ ایک گردشِ چشم میں لوگوں کے دل دانۂ اشک کی طرح پس جاتے ہیں تالیف کی یہ کیفیت کہ شرحِ محامد میں خلائق کے قلم گھس جاتے ہیں پھر اب اور کیا چاہیے ہو کونسی بات نہیں ہے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمہاری کوشش تحصیل حاصل میں ناسپاسی کی حد کو نہ پہنچ جائے انسان ہوس کو جتنا بڑھائے بڑھتی ہے شاہنشاہی ہونے کے بعد بھی یہ بس نہیں کرتی ہے میری یہ دعا ہے کہ جہاں خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے وہاں

وہاں قناعت کی دولت بھی عطا کرے۔

اے قناعت تو نگرش گرداں ‌‌ ‌ ‌ کہ در آئے تو ہیچ دولت نیست

مولوی امیر الدین احمد الہ آبادی آنریری مجسٹریٹ

مکرمی، میرا فغاں جو اپنی نارسائی سے میرے کان تک بھی نہ پہنچتا تھا آپ کی عنایت سے تمام زمانے کے گوش زد ہوا میرا خونابۂ جگر جس کو نارسائی سے میرے دامن کے سوا کسی نے نہ دیکھا تھا آپ کی توجہ سے ایک عالم کا روشناس بنا میرا دلِ غم دوست کبھی فغاں کرنے سے باز نہیں آتا اور میرے ناسور جگر سے ہمیشہ خونابہ ٹپکا کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب بھی جو فغاں لب سے نکلے آپ کے کان تک پہنچے۔ اور جو خونِ جگر سے آپ کی نظر سے گزرے یہ خواہش بھی میرے دل میں آپ کی قدر دانی کی نظر سے پیدا ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو دلجوئی کرے اسی سے دردِ دل کہنے کو جی چاہتا ہے اور جو آستین شفقت سے آنسو پونچھے اسی کے آگے زیادہ رونا آتا ہے ورنہ میں نے کبھی ایسی تمناؤں کو دل میں آنے نہیں دیا ہے اور اس سودا سے ہمیشہ میرا دماغ خالی رہا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ اردو فارسی نظم و نثر جمع ہوئے ان کو ایک مجلد میں لکھوا کر آپ کی خدمت میں نذر کرتا ہوں، آیندہ بھی جو کچھ اس میں درج کرنے کے قابل ہوگا بھیجتا رہوں گا۔

مولوی محمد حامد

میں اس خط کے عنوان کو القاب سے خالی رکھتا ہوں اس لئے کہ القاب مکتوب الیہ کی شان کے موافق لکھا جاتا ہے اور جب اُن سے محض لاعلمی ہو تو کیا لکھا جائے اور آپ سے التدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی شان کے لائق لکھ لیں۔ اس محبت غائبانہ کا کیا شکر ادا کروں کہ آپ کو میری خیریت کی طرف تعلق خاطر ہے اور آپ نے اس کو

مجھ سے دریافت کیا، الحمد للہ ہر حال میں خوش حال ہوں اور گوشہ عافیت میں زندگی کی بسر عاد پوری کر رہا ہوں، قصہ کہانیوں میں سنا کرتا تھا کہ اس قسم کے دوست بھی ہوتے ہیں کہ محبت رکھتے ہیں اور نظر نہیں آتے تو استعجاب ہوتا تھا، جب سے یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ دل سے تو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور آنکھوں سے میری چھپے رہتے ہیں، تب سے وہ تعجب جاتا رہا، اب یہ دعا ہے کہ خالق جن و انس آپ کے دل میں میری محبت کو اتنی بڑھائے کہ وہ ایک دن کھینچ کر آپ کو میری آنکھوں کے سامنے لاوے۔

خواجہ غلام نبی

برادر عزیز از جان جنت نصیب مغل صاحب مرحوم کا ایسا حادثہ ہے کہ اگر کہوں قیامت آ گئی یا آسمان ٹوٹ پڑا یا زمین پھٹ گئی یا دنیا اجڑ گئی تو بھی کم ہے، کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس کی تعبیر کروں اور کہوں کہ کیا ہوا، ایسی مصیبت ہے کہ اگر پہاڑ پر پڑے تو وہ بھی پاش پاش ہو جائے، کس دل اور زبان سے تمھیں کہوں کہ صبر کرو۔ صبر کی بھی ایک غایت ہوتی ہے یہ تو اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے، یہ وہ واقعہ ہے کہ صبر خود بے صبر ہو، نہ زبان کچھ کہہ سکتی ہے نہ قلم کچھ لکھ سکتا ہے، دل فولاد کا کلیجہ پتھر کا کر لوں تو بھی کچھ لکھا نہ جائے پھر کیا لکھوں بس یہ کہتا ہوں کہ جس خدا نے یہ مصیبت ڈالی ہے وہی صبر بھی دے۔

محب

از نالۂ دل ما تا کے رسیدہ رفتن ‏ زیں دردمند حرفے باید شنیدہ رفتن

میں نے سنا کہ آپ یہاں سے تشریف لے جانے والے ہیں اور صبر میرے دل سے طاقت میرے جسم سے روشنی میری آنکھوں سے فرحت میری طبیعت سے سکون میرے

حوصلہ سے رخصت ہو کر آپ کی ہمراہی کا ارادہ رکھتے ہیں، ایک تو آپ کا سدھارنا دوسرے اپنے رفقائے قدیم کا جدا ہونا جو قیامت میرے سر پر لائے گا وہ ظاہر ہے مگر کیا کیجئے نہ آپ کو روکنے کی قدرت ہے اور نہ ان سبھوں کو منع کرنے کی طاقت، یوں تو بسر نہ ہوگی اور اجل کے ناز معشوقانہ الگ ہی جان لینے والے ہیں جب تک اس کا جی نہ چاہے گا وہ آئے گی نہیں، اس لئے میں نے بھی تنہائی اور بے لبسی اور بیکسی اور درد اور گریہ اور بیقراری کو بلانے کا ارادہ کر لیا ہے، یہ سب ایسے سراپا اخلاق ہیں کہ جھوٹوں یاد کیجئے تو سچوں دوڑے چلے آتے ہیں اور میرے ساتھ تو بالخصوص انہیں جیسی محبت ہے وہ کا ہے کو کسو کو کسی سے ہوتی ہے، انہیں سے جی بہلاؤں گا اور انہیں کے ساتھ بسر کروں گا آپ سے اتنی استدعا ہے کہ مجھ سے مل کے دو باتیں میری سن کے جایئے گا۔

منشی ولایت علی خاں

مخدوم - آپ کی عیادت فرمانے، نے مجھے ممنون ہی نہیں کیا بلکہ اتنا مسرور ہوں، میں اچھا ہو گیا، اب بفضلہ بالکل تندرست ہوں، یہاں تک کہ پندرھویں رمضان شریف سے روزے اور تراویح بھی شروع کر دی ہے آپ کی ان غائبانہ عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کا قصد تو جب کرتا کہ ممکن ہوتا محال ہے اس لئے اس کی مجال نہیں۔

منشی ولایت علی خاں

مخدوم - حکیم صاحب کی تحریر سے مجھے آپ پر اُس صدمہ کا پہنچنا معلوم ہوا جس کو سن کے میرا دل لرز گیا انسان اگر ایک پھول کا درخت لگاتا ہے تو اس کے پھول کا زمین پر گرنا ناگوار گذرتا ہی جب نور بصر اشک کے قطرہ کی طرح دامنِ صحرا پر گرے لختِ جگر

امید کے مانند خاک میں ملے جس چاند سے دنیا آنکھوں میں روشن ہو وہ چھپ جائے جس نخلِ مراد سے گھر گلشن ہو وہ صرصرِ خزاں سے خشک نظر آئے جس کا نام سو دعاؤں کے ساتھ لیتے ہوں اس کے نام کے ساتھ ہزاروں نالہ و فغاں کا ہجوم ہو جس کی درازیٔ عمر کی امید پر باوجود زندگی سے نفرت ہونے کے جیتے ہوں اس کے فراق میں بن آئے مرجانے کی دھوم ہو تو پھر اگر سینہ گریبان سے پہلے چاک ہو دل و جگر کا قصہ بغیر دشنہ اور خنجر کے پاک ہو حیرت سے اشک خون کے مثال سوکھ جائے سکتہ سے آہ راہ بھول کے لب تک نہ آئے پھانسی کی طرح گریبان گلوگیر ہو دامن کی وہ دھجیاں اوڑیں جو ایک ایک ان میں سے پاؤں کے لئے زنجیر ہو اندھیری رات میں روشنی ہو تو اپنی آہ سوزاں سے روز سیاہ میں نور ہو تو اپنے داغ سینۂ بریاں سے خشک لب تر ہوں تو اپنے آنکھوں کے پانی سے گوش آشنا ہوں تو اپنے ہی غم کی کہانی سے وصال یار سے زیادہ موت کا انتظار ہو مال و متاع دنیا سے صرف کفن درکار ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں آپ اپنے فرزند کے انتقال سے ان حالتوں کے مصداق ہوں اور میں لکھوں کہ صبر کیجئے کیوں کر لکھوں خود غم و درد کا مبتلا ہو کر ایسی بیدردی کروں یہ مجھ سے نہ ہوگا اتنا البتہ کہتا ہوں کہ آپ صوفی مشرب بھی ہیں تصحیح خیال ایسے ہی دقتوں میں کام آتی ہے ہجوم غم میں حقیقت ہی پر غور کرنے سے طبیعت تسکین پاتی ہے اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اسی میں مصروف رکھے اور اضطراب اور اضطرار سے بچائے۔

مولوی وکیل احمد مددگار صدر عدالت گلبرگہ

مراد و حرف زدن با تو مشکل افتاد است   کہ من علیلم و بہلوئے من دل افتاد است

مریض کو مرض کا زمانہ بسر کرنا ہی دشوار ہوتا ہے چہ جائیکہ خود بیمار اور دوسرے

بیمار کا تیماردار ہو جیسا کہ میں اس شعر کا مصداق ہوں مگر سچ یہ ہے کہ کام آپ کا خالی کوئی حکمت سے نہ پایا امراض بنائے تو مسیحا کو بنایا۔ اس ناچاقی مزاج میں کہ ایک مہینہ سے تحریک نزلہ اور شدت صرفہ نے جینا دشوار اور زندگی سے بیزار کر دیا ہے آپ کے الطاف صحیفہ کا نزول آپ کے دیوان اور مثنویوں کا وصول دواخانہ غیب سے نسخہ شفا کا عنایت ہونا ہے اس تفاول نیک سے امید ہے کہ صحت جسمانی جلد حاصل اور ان کے مطالعہ سے مرض روحانی بھی زائل میری اُستادی پر تو زمانہ کو فخر کیا ہوتا کہ اس کی قابلیت ہی نہیں رکھتا اس فخر پر البتہ مجھے ناز ہے کہ اس بانگ دہل نے مجھے آپ کی مخاطبت اور نعماء غیر مترقبہ کی عنایت کے قابل کیا اس کا شکریہ مجھ سے صحت میں بھی ادا نہ ہوتا اس بیماری میں کب ادا ہو سکتا ہے مجبورانہ سکوت اختیار اور یہ گوش گزار کرتا ہوں۔
خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

مُحب

تلافی ہمہ بیرحمی وجفائے شما به یک نگاه ادا شد زہے ادائے شما

محبت نامہ کے پہنچنے نے ساری شکایتوں کو دل سے دھو ڈالا کیوں کر ایسا نہ ہوتا میں طفیلی سلام کا مشتاق تھا آپ نے براہ راست مجھی کو خط لکھا جو ایک پھول ڈھونڈھتا ہو وہ چمن میں پہنچے جس کی آنکھیں پیرہن کے انتظار میں سفید ہوئی ہوں وہ یوسفؑ کو دیکھے ذرہ کے طالب کو خورشید جلوہ دکھلائے۔ قطرہ کے آرزومند کے سامنے دریا لہرائے بلور کے تلاشی کو الماس ملے روپے کے محتاج کے واسطے خزانے کا دروازہ کھلے طبیب کو بلائیں اور مسیحا آئے دوا منگائیں اور شفا مل جائے صدف کا متمنی صاحبِ دُرِ شاہ دار ہو بوریئے کا حاجتمند مالکِ تختِ زرنگار ہو جو روزنِ دیوار سے دیکھ لینے کو غنیمت سمجھے اس کے سامنے معشوق بے حجاب ہو جو نگہت زلف کے اشتیاق

ہیں باد صبا کا منتظر رہے اُس کے ہاتھ میں کاکل پر پیچ و تاب ہو جو بند قبا تک ہاتھوں کی رسائی کو طالع کی رسائی سمجھتا ہو وہ بند قبا کھولے جو دُعا سے زیادہ گالی کا اشتیاق رکھتا ہو محبوب اس سے مہربان ہو کے بولے جو دروازہ تک پہنچنا معراج جانتا ہو وہ محفلِ دلدار میں بلایا جائے جو دور کھڑے رہنے کو بخت کی بلندی تصور کرتا ہو وہ پہلو میں بیٹھایا جائے تو اُسے شادیِ مرگ ہونا ضرور ہے' وہ تو کہیئے کہ کبھی ناکامی بھی کامیابی کی ذریعہ ہوتی ہے کبھی محرومی بھی مطلب تک پہنچاتی ہے سخت جانی جو اس درجہ تک پہنچتی تھی کہ اس نے غمِ فراق سے مرنے نہ دیا تھا اس نے اس خوشی میں شادی کی موت سے بچا لیا ایک عمر کے بعد خدا نے یہ دن دکھلائے کہ جس زبان پر ہمیشہ قسمت کی شکایت کی تکرار تھی وہ آج اس کی شکر گزار ہے الٰہی آیندہ بھی مجھے یہ خوش وقتی نصیب رہے کہ یار کے استغنا سے دُور ہوں اس کا التفات مجھ سے قریب رہے۔

حافظ محمد زکریا خاں زکی

مخدوم۔ آج تیسرا چوتھا دن ہے کہ صبح کو جو خواب سے بیدار ہوا تو ایک ایسی خوشی دل پہ چھائی کہ آنکھ کیا کھلی گویا درِ نشاط کھل گیا دیکھتا ہوں تو در و دیوار پر کچھ اور ہی چمک دمک ہے زمین و آسمان پر عجب طرح کے نور کی جھلک ہے صبح کے دلبر صبیح صورت کی صورت پر کچھ اور ہی جلوہ ہے شاہد آفتاب کا اور دنوں سے زیادہ نور افشاں چہرہ ہے مجھے حیرت ہوئی اور آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا کہ الٰہی ہے کیا، سحر عید ہے، یا صبح نوبہار ہے روز نوروز ہے جو ایسی مسرت نمودار ہے اس کے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ یہ سب ہی مگر تیرے غمزدہ دل کو خوشی سے کیا سرو کار کبھی سنا ہے کہ ماتم سرا میں ہنسی آئے اور روتا ہوا باتوں سے بہل جائے' اس کا غم تو خوشی میں اور بڑھتا ہے عید اس کے لئے محرم ہے بہار اس کی

آنکھوں میں خزاں نوروز ہر روز سے زیادہ غم اندوز ہے ہنساؤ تو اسے رونا آتا ہی بہلاؤ تو اور بھی مچل جاتا ہے اس کے حق میں صبح ایک اژدہا ہے خونخوار ہے جو شرق کی غار سے نکل کر آفتاب کا کفچہ پھیلائے ہوئے چلا آتا ہے۔ شام ایک دیو سیہ کار ہے جو مغرب کے کوہ قاف سے سر اٹھائے ہاتھ پھیلائے آکر دبائے ڈالتا ہے اسی حیرت میں تھا کہ ڈاک کے ہرکارہ نے آپ کا دیوان لاکر دیا، پہلے جو چھپنے کا ذکر آپ نے کبھی لکھا نہ تھا دفعتاً اس کا پہنچنا نعمتِ غیر مترقبہ ہوا اب سمجھا کہ یہ تمام جوش نشاط اور ہجوم انبساط اُس کی آمد کا تھا کیوں کر نہ ہوتا ایک دولت کسی کے ہاتھ آئے تو جامے میں نہیں سماتا مجھے تو اس ایک چیز کے ملنے سے دو دولت ملی ایک سخن کی دولت دوسرے آپ سے ہمکلامی کی پھر مجھے جتنی فرحت ہو کم ہے۔ آپ کے دیوان کی تعریف آپ کو لکھنی، یوسف کو آئینہ دکھانا ہی اور خورشید کو نور کا قصہ سنانا ہے لیکن اتنا لکھے بغیر تو رہا نہیں جاتا کہ سلاست زبان حسنِ بیان فراوانی فصاحت بے پایانی بلاغت دل نشینی معنی رنگینی الفاظ جدت مضامین نازکی خیال والائی تلاش انگیز ادا بلندی فکر رسائی ذہن، استخواں بندی ترکیب بدائع صنائع کیا ہے جو اس میں نہیں ہے خدا آپ کو درازی عمر میں رشک افزائے خضر والیاس کرے کہ ایسے دیوان اور بہت سے تصنیف ہوں میں تو کہاں ہوں گا میرے جانے کے بعد آنے والے سرگرم تعریف ہوں۔

منشی فدا علی عیش

اللہ اکبر۔ ایسے زمانے میں کہ ایک عمر کی ملاقات پر دو دل حروف لفظ دو دل کی طرح ملتے نہیں ایک دوسرے سے جدا ہی رہتے ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل کو محبت سے وہ پیچیدگی ہوتی ہے جو لفظ محبت کے حروف کو باہم ان

میں بھی اعلیٰ درجہ کے وہ حضرات ہیں جو دل میں الفت کو راہ دینے کے لئے آنکھوں کے
واسطے کے پابند نہیں ہوتے، جیسے آپ ہیں پھر آپ نوادرِ روزگار اور مغتنمات زمانہ سے
کیوں نہ ہوں، یہ آپ کی قدر دانی ہے کہ آپ نے مجھے الطاف غائبانہ کا سزاوار اور
میرے ہذیان کو قابل التفات سمجھا، ورنہ میں اس لائق ہوں نہ میرا کلام میں ہستی کے لئے
باعثِ عار و ننگ ہوں اور وہ آئینہ سخن کے واسطے زنگ لکھنؤ میں آپ کے صاحبزادے
کی ملاقات سے بہت مسرور ہوا تھا الولد سر لابیہ جب آپ جامع کمالات
ہوں تو ان کا بھی محمود الصفات ہونا ضرور ہے نسخہ "سیر عشق" کی سیر سے مجھے وہ
لطف حاصل ہوا جو آپ کو اپنی سیر سے نہ ہوا ہوگا اب خدا سے یہ التجا ہے کہ آپ کی
ملاقات سے جلدی حصول سرور ہو اور آپ سے یہ تمنا ہے کہ جب تک اس کا وقت
آئے المکتوب نصف الملاقات پر عمل آپ کا دستور ہو۔

منشی علی عمر صاحب سکرٹری کتب خانہ اسلامیہ بمبئی

قدر دان میرے۔ الطاف نامہ آیا ایزدِ فریاد رس کا شکر ہے کہ میرا فغاں
کس مشنو آپ کے کان تک پہنچا مجھے تو یہ ڈر تھا کہ نصیب دشمناں دردِ سر بڑھائے
گا، یہ کسے امید تھی کہ ایسا ناموزوں فغاں پسند آئے گا سچ تو یہ ہے کہ محض آپ
کی اور وہاں کے حضرات کی قدر دانی ہے ورنہ وہ فغاں جو گوشِ شنوا کی تلاش
میں ہمیشہ زمین سے آسمان تک جائے بلکہ عرش کو جنبش میں لائے اور کوئی اُسے
کان لگا کر نہ سُنے کب قبول کے قابل ہوا اور وہ خونابہ جو دیدۂ بینا کی تمنا میں دن
رات جگر سے نکل کر دامنِ صحرا تک پہنچے اس طرح کہ اس کی روانی پر دریا کو رشک
آئے اور کوئی اسے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھے کس لئے کوئی اس کا مائل ہوا انکا مہ قدر افزائی
کی نعمت کی ناسپاسی تھی اس وجہ سے آج اس کو یعنی خونابہ جگر کو بھیجتا ہوں خدا کرے

یہ بھی اپنا رنگ جمائے آپ حضرات کی خاطر دشوار پسند کے پسند آئے۔

حکیم قیام الدین بخت جونپوری

دولت آں است کہ بیخون دل آید بکنار ورنہ با سعی عمل باغ جہاں ایں ہمہ نیست

کسی معرف کا احسان اٹھایا، کسی متوسط کا ممنون ہوا، یہ کچھ نہ سہی آنکھوں ہی کو میانجی کرنا پڑا تب دو دلوں میں ارتباط کرنا پڑا تو کیا، لطف تو جب ہے کہ یہ سب بالائے طاق رہیں آنکھیں بھی کچھ نہ دیکھیں بیگانہ وار رہیں، کان نہ سُنے زبان کو موقع بولنے کا نہ ملے اور دو دل باہم آشنا ہو جائیں خدا کا شکر ہے کہ مجھے یہ دولت نصیب ہوئی آپ سے بظاہر ملے نہیں ایک دوسرے سے دور رہے اور محبت دلوں سے قریب ہوئی میرا نظم و نثر اردو اور فارسی اس قابل تو تھا نہیں کہ میں اُسے چھپواتا اپنے عیوب کو ظاہر کر کے کاغذ کا منھ کالا کرنا، ان کی حقیقت تو ان کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے ایک فغان بخبر دوسرا خونابہ جگر رازداران محبت خوب جانتے ہیں کہ فغان نوحہ گر کو کون کان لگا کر سنتا ہے، خونابہ جگر کو کون آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے، وہ ہمیشہ ہذیان مجنوں کی طرح بے اثر ہوتا ہے اور یہ خون نخچیر کے مانند ہدر، مگر عیب کے خریدار دوست ہی ہوتے ہیں۔ مولوی امیرالدین احمد صاحب نے جو اپنے سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں دونوں مجموعہ مجھ سے چھین لیے اور چھپوا دیا ابتدا میں کچھ جلدیں ان کی میں نے لے لیں اور دوستوں کو دیں افسوس ہے کہ اب میرے پاس باقی نہیں ہوتیں تو ضرور ہدیۂ خدمت کرتا آپ سے سخندان سے دریغ رکھ کے جان سخن پر حیف روا نہ رکھتا آپ مولوی صاحب موصوف سے البتہ طلب کر سکتے ہیں پتہ ان کا یہ ہے شہر الہ آباد محلہ بیجنے پور مکان حضرت حکیم بادشاہ صاحب قدس سرہٗ، اگر خواہی

بخواہی اس کے دیکھنے سے تضیع اوقات منظور ہو تو منگوا لیجئے سبقت الطاف کا جیسا اس دفعہ سپاس گزار ہوں آئندہ بھی اس کا امید وار ہوں۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان بہادر

ہیتے شد کہ رہِ مہر دوفا مسدود داست

نہ کسے میرود آنجا نہ کسے می آید

کیوں مخدوم آپ کو کبھی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشین درویش عزلت گزین بیخبر دل حزیں نام میرا دعا گوئے قدیم الہ آباد میں رہتا تھا کچھ اس کی تو خبر لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا۔ یا جب وہ اپنی خبر دے تب آپ بھی کچھ پوچھ لیں، ورنہ کچھ اس سے غرض نہیں کہ کون تھا اور کدھر گیا۔

این نہ بود امید واری گریہ می آید مرا

بہرحال وہ تو آپ کا ویسا ہی فدائی ہے جیسا تھا۔

امروز یقیں شد کہ نداری سر ابلی — بیچارہ غلط داشت بمہر تو گمانہا

محب

افسوس۔ اس طلسم دنیا میں کیا خاک کوئی دل لگائے راحت سرائے عدم سے اس شورش کدہ میں آنے کے غم کو کس طرح بھلائے جہاں نہ کسی کی بات کو قیام ہے نہ کسی قسم کا آرام ہے بے ثباتی کی یہ حالت کہ چشم زدن میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے بہار آتے ہی پھولوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیتی ہے کیا خوشی سے پھولتے ہو ہم خزاں کے آنے کا پیغام لاتے ہیں، بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب ہنستے ہیں، خوش ہوتے ہیں اور وہ اس پر روتا ہے کہ ہم تو مرنے کو یہاں آئے ہیں صبح کو نور کا تڑکا ہے تو شام کو

ظلمت کا دہڑکا ہو شب کو انجم کی انجمن کا اہتمام ہے تو دن کو اس کی زرکی تمام ہے آرامی کی یہ کیفیت ہے کہ جس راحت کو دیکھیے اس کے پردہ میں رنج چھپا ہوا ہے غنچہ کے کھلنے کو لوگ شگفتگی جانتے ہیں اور وہ زبانِ حال سے کہتا ہو کہ ہم اس گل کاہ میں اپنا چاک جگر دکھاتے ہیں تصویر کو ہر ایک مکان کی آرائش اور زینت خیال کرتا ہو اور وہ خاموشی سے یہ مضمون ادا کر رہی ہے کہ ہم اس عبرت آباد میں اپنے سر کو دیوار سے ٹکراتے ہیں زندگی جسے سرمایۂ آسائش کہتے ہیں درحقیقت نفس شماری ہے عالم سے ہر شخص سکون اور قرار کا طالب ہے اور فصلوں کے تغیر سے ظاہر ہے کہ وہ خود گرفتارِ بیقراری ہی ہنسی کی کثرت میں آنکھوں سے آنسو کا ٹپک پڑنا اس کی دلیل ہے کہ شادی میں غم شامل ہے محاسب عقل برسرِ حساب آئے تو ثابت ہو کہ یہاں رنج مسرت سے فاضل ہو بہت صحیح کہا ہو ؎

جہاں میں عرصۂ شادی سے سوا دہ چند ہو غم کا ۔۔۔ کہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہو محرم کا

کمال افسوس اس کا ہے کہ جو زمانے کے لئے باعث فخر و ناز ہوتے ہیں زمانہ انھیں سے دغا کرتا ہو جن سے اُسے زیب و زینت ہوتی ہے وہ انھیں کو خاک میں ملاتا ہو دور کیوں جلیے ابھی کل کی بات ہو کہ آپ کے بھائی بزم جہاں کے چراغ تھے آج دلِ احباب میں داغ ہیں، کل لوگ ان کے ذکر سے خوش ہوتے تھے آج ان کی یاد میں روتے ہیں ایسے بھائی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جائیں یہ صدمہ آپ کے لئے کچھ کم نہیں مگر صبر کے سوا اور چارۂ الم نہیں خدا انہیں جنت میں جگہ دے آپ کو توفیق صبر عطا کرے یہ مصیبت آپ کے لئے مقطعِ مصائب و آلام ہو آئندہ جو پیش آئے وہ مطلعِ انبساط و آرام ہو۔

عُجب

یاس و غم و آرزو وجمع یہ سب چیز ہے ۔۔۔ بے سمائی تری دل بھی عجب چیز ہو

جب حکیم علی الاطلاق نے رنج کو شکل اور عجز کو مجسم کرکے اس ہیکل کا نام انسان

رکھا جیسا خود فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد اور پھر اس کو اشرف المخلوقات
کے خطاب سے مخاطب کیا تو اس نے اپنی حکمت بالغہ سے ایک مضغہ صنوبری دل نام اس
حوصلہ کا بنا کے اس کے سینہ میں رکھ دیا جس میں دونوں جہان کی آرزو اور تمنا امید اور
یاس غم اور الم رنج اور محن اندوہ اور ملال سب کی گنجائش بدرجہ کمال ہو اور اس کو اس صنعت
سے بنایا کہ نزاکت میں تو شیشے سے زیادہ سختی برداشت کرنے میں پتھر ہو جانے کو آمادہ
اس کے تو علم میں تھا کہ اس کو جو سب سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا مرتبہ دیا گیا ہے تو اسی کو
اعظم مصائب اور بلیات کا مورد بھی ہونا ہوگا اگر اس کو ایسی چیز نہ دی جائے گی تو ان
مصیبتوں کا تحمل کیونکر کرے گا اور بعد اس کے اس کو ولقد کرمنا بنی آدم کا خلعت خاص
عطا کر کے عالم امکان میں بھیجا تو علاوہ اور مصیبتوں کے ایک نہایت سخت مصیبت
مفارقت کی اس پر نازل کی یعنی جسے جی چاہے اس کی جدائی الحفیظ الامان جن پر پڑتی
ہے وہی اس کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں، یہ ایسی بلا ہے جس سے بے نشتر چبھائے کلیجہ
خون ہو کر بہہ جاتا ہے بے آگ لگائے سینہ آتش کدہ بن جاتا ہے اسی سے آنکھیں دریائے
اشک کے طوفان میں امید کی کشتی کو ڈباتی ہیں، اسی سے آتشیں آہیں خرمن تمنا پر یاس
کی بجلی گراتی ہیں، اسی سے جوش حیرت میں انسان مبہوت ہو جاتا ہے کہ اپنے حال پر ہنسی
نہیں آتی اسی سے از خود رفتہ ہو کر آدمی کو ایسی چپکی لگ جاتی ہے کہ اپنی حالت بھی کہی
نہیں جاتی اسی سے نیند اور آنکھ اور سر اور بالیں میں عداوت ہوتی ہے، اسی سے
قرار اور طبیعت تسکین اور مزاج میں مغایرت ہوتی ہے اسی سے بن آئے مر جاتے ہیں اگرچہ
موت کا ایک دن مقرر ہے اسی سے قسمت پلٹ جاتی ہے ہرچند وہ بات بدلتی نہیں،
جو مقرر ہے اسی کی جادوگری ہے کہ زمین پر پڑے ہوئے خاک اڑاتے ہیں اور دل ڈوبا
جاتا ہے اسی کی نیرنگ سازی ہے کہ آہ شرر افشاں سے سرو چراغاں بنے رہتے ہیں اور
چراغ حیات بجھا جاتا ہے، اسی کے کرشمے ہیں کہ ضعف سے خود تو اٹھا نہیں جاتا مگر شور فغاں

سے قیامت سر پہ اٹھاتے ہیں نقاہت سے تنکا تو ہلایا نہیں جاتا لیکن آہِ رسا سے عرش کی زنجیر ہلاتے ہیں، اسی سے نازپروردوں کے مصیبت میں بادیہ پیمائی ہوتی ہے اسی سے پاؤں کے آبلوں کو صحرا کے کانٹوں تک رسائی ہوتی ہے اسی سے راحت کی امید پر آنکھیں بند کیجیے تو وہ خواب میں نظر نہیں آتی، اسی سے آسائش کی آرزو میں پلک نہ جھپکائے تو بیداری میں وہ صورت نہیں دکھاتی، سخت جانی سے اپنے کو پتھر بنائے تو یہ اُسے تیشہ بنا کر توڑتی ہے خاکساری سے اپنے کو خاک میں ملائے تو یہ نقشِ قدم بنا کر پامال کر کے چھوڑتی ہے، اسی سے دم سینہ ایسا گھبراتا ہے جیسے قیدی قید خانہ میں گھبرائے اسی سے کلیجہ امنڈ کر اس طرح منھ کو آتا ہے جس طرح جان لبوں پر آئے اسی سے انسان بغیر گلے پر چھری پھیرے مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو کر ٹھہر جاتا ہے اور یہ مر کر بھی تڑپتا ہی رہتا ہے اسی سے آدمی جرس کے مانند فغاں کیا کرتا ہے تفاوت اس قدر ہے کہ وہ منزل پر پہنچ کر چپ ہو جاتا ہے اور یہ منزل گور میں بھی چلاتا ہی رہتا ہے، اسی کے مارا ہوا نے کے مثال نالے کیا کرتا ہے مگر اس کو سب سنتے ہیں اِس کو کوئی سنتا نہیں، اسی کا گرایا ہوا دیوارِ کہنہ کی صورت خاک پر گرا رہتا ہے لیکن اُسے لوگ پھر اُٹھاتے ہیں اور یہ کسی کے اٹھائے اٹھتا نہیں، اسی کے مبتلا کو زہر کی اتنی ہی تلاش ہوتی ہے جتنی سکندر کو آبِ حیات کی تھی اسی کے گرفتار کو موت کی اتنی ہی جستجو ہوتی ہے جتنی مجنوں کو لیلےٰ کی ملاقات کی تھی، اسی کے لاغر بیمار کو تارِ بستر سے جدا کرنا ملک الموت سے بھی ہو نہیں سکتا، اسی کے شب بیدار کو خوابِ مرگ بھی چاہے کہ دم بھر سلائے تو وہ سو نہیں سکتا انسان اتنی مصیبتیں اٹھا کر جو زندگی کا دم بھرتا ہے اپنے کو زندوں میں شمار کرتا ہے تو حضرتِ دل ہی کے بدولت اگر اُسے حوصلہ صبر و شکیبائی کا نہ ہوتا، اس کا ظرف اس سمائی کا نہ ہوتا تو یہ خاک کا پُتلا یہ پانی کا بلبلہ اتنی آفتیں جھیل سکتا۔ ایسی جانبازی کا کھیل کھیل سکتا، میں بھی جو تمہاری مفارقت میں اب تک

جان نہ ہونے پر زندہ کہلاتا ہوں جینے کے غم کو موت کی امید سے تسکین دے کر بہلاتا ہوں
تو انھیں کی ہمت ہے ورنہ ماہی آب سے چکور مہتاب سے پروانہ چراغ سے بُلبل باغ سے
دور رہ کر جیے تو جیے میں تم سے جدا رہ کر ہرگز جی نہیں سکتا میرا تمہاری جدائی میں جینا ایسا
محال ہے جیسا بے قضا آئے کسی کا مرنا اتنے دنوں جس طرح گزرے وہ گزرے آخر کہاں تک،
ہر امر کی ایک غایت ہر بات کی ایک نہایت ہوتی ہے۔ بس اب مجھے اس عذاب سے چھڑاؤ
اس جور و ستم سے باز آؤ نہیں تو ایک دن وہ دن آئے گا کہ لوگ تم سے آکر کہیں گے۔
نکل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر چل بسا وہ آج سب ہستی کا سامان چھوڑ کر

شیخ رفعت علی

صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت غنچۂ باغ دل من زیب دستارے نہ شد

الہ آباد کا دربار ہو لیا لکھنؤ کا دربار ختم ہوا۔ کوئی آتا تو کیا یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ مولوی
شیخ عبد الحق صاحب خیر آبادی نے کس دربار میں شمس العلما کے خطاب کی سند حاصل کی شیخ رفعت علی
صاحب نے کہاں کہاں کی سیر دیکھی کس کس سے ملے کسی نے بھی نہ لکھا کہ تم سے ملنے کا وعدہ
وفا کرنے کا یہ سبب ہوا۔ وفورِ اشتیاقِ ملاقات پر تو یہ حال ہے کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا یہاں
قبل دربار کے تو دن گن گن کے کاٹے دربار کے بعد سے تردد میں تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے
ہیں ؎ من بیوفانیم بوفا می خورم قسم من چوں شما نیم بشما می خورم قسم

غلام علی خاں

رسائی کان تک تیرے ہوئی حاصل نصیبوں سے نہ کیونکر رشک گمنامی سو میری ہو وے شہرت کو
باوجود محرومی ملاقات ظاہری سے آپ کی غائبانہ محبت نے نہ صرف آپ کے وسعت
اخلاق ہی کا ممنون کیا بلکہ آپ کی قدردانی نے حضیض ہیچمیرزی سے اوجِ شہرت پر پہنچا دیا

میں نے کبھی اپنے کو انشا پردازوں میں اور شاعروں میں شمار نہیں کیا اس سبب سے اگر کبھی بے اختیاری دل سے کوئی نالہ بپیرایۂ نثر میں یا کوئی فغاں سلسلہ نظم میں لب تک آیا اور غمازی خامہ نے اسے گوشِ صفحہ تک پہنچایا تو وہ ترتیب اور تدوین سے ناکام رہا۔ میرے ایک عنایت فرمانے جو اس شہر کے مشاہیر رؤسا سے ہیں اور مجھ پر مجھ سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں ان اوراق پریشاں کو شیرازہ بند جمعیت کرکے زینت اشاعت مزّین کرنے کی غرض سے چھپوا دیا ہے میرے پاس اس کی جلدیں نہیں ہیں انہیں کے پاس ہیں ان کا نام نامی مولوی امیر الدین احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ اور نشان سکونت شہر الہ آباد محلہ یحییٰ پور ہے اُن سے آپ طلب فرمائیں، تو وہ بے تامل بھیجدیں گے، میں نے ان کو لکھ دیا ہے خود اس خدمت کے سرانجام نہ دینے سے نادم اور خجل ہوں۔ والسّلام۔

استفسار

قاضی علی احمد بدایونی

مکرمی۔ آپ جو تحریر فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت امیر خسروؔ کے اس شعر پر ؎

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز ۔۔۔ دردہا دادی و درمانی ہنوز

یہ اعتراض کیا کہ جب جان ہی تن سے نکل گئی تو معشوق اس میں کیونکر رہا اور آپ نے اس میں یہ تاویل کی کہ جان مجازی کے جانے کے بعد جان حقیقی باقی رہتی ہے اس تفریق اور تقسیم جان کو جو آپ فرماتے ہیں خارج از مبحث رکھ کر پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ اعتراض کیسا ہے ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی ناواقفی پر دلالت کرتا ہے ظاہرا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جسم سے علیحدہ ہوجانے کے بعد معدوم اور فنا ہوجاتی ہے اس وجہ سے اس میں کسی کیفیت کا باقی رہنا محال جانتے ہیں حالانکہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کچھ حضرات صوفیہ ہی پر موقوف

نہیں شارعین اور متکلمین منصورفین جمہور کو اس پر اتفاق ہے کہ جان تن سے نکلنے کے بعد باقی رہتی ہی اور جب یہ مسئلہ مسلمہ ٹھہرا تو پھر اس میں کسی کیفیت کا باقی رہنا کیوں غیر ممکن خیال کیا جاتا ہی اگر کوئی یہ کہے کہ صراحی سے شربت نکل گیا مگر پانی میں قند کی شیرینی باقی ہی یا شیشہ سے گلاب اونڈل پڑا مگر گلاب میں بو باقی ہی تو مستبعد نہ سمجھا جائے اور یہ کہنا کہ جان تن کر علیحدہ ہوئی اور جان میں تعلق محبوب باقی ہی بعید از قیاس کہا جائے تو حیف کی بات ہے جو لوگ اسرار محبّت سے واقف نہیں ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ محبت بھی مثل اور امراض کے ایک مرض ہی کہ اس کا قیام اسی وقت تک ہو سکتا ہی جب تک جان تن میں ہو مگر جو راز محبت کو جانتے ہیں وہ اس کو مانتے ہیں کہ محبت صادق کا تعلق جان ہی کے ساتھ ہوتا ہی اور گو جان تن سے جدا ہو وہ تعلق ہرگز جان سے جُدا نہیں ہوتا۔ حضرت امیر بھی یہی فرماتے ہیں کہ جان کو تم نے جسم سے علیحدہ کیا لیکن تم جان سے علیحدہ نہ ہوئے یعنی تمہاری محبت کا تعلق باقی رہا غنیمت سمجھئے کہ معترض نے یہ اعتراض نہ کیا کہ معشوق اس ڈیل ڈول پر جان کے اندر کیسے سما گیا جو کہتے ہیں درجانی ہنوز ایسے اعتراض اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اُسے سُن کر جواب دینے میں اوقات ضائع کرے۔ یہ آپ کی خاطر تھی کہ اتنی خامہ فرسائی کی اور پھر وہ بھی رمضان شریف میں۔

سید محمد محسن خاں بہادر ذوی القدر

مکرمی۔ حضرت حافظ کے اس شعر میں ؎

ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقان بپوشانی

کہ سودائے جہاں داری غم لشکر نمی ارزد

معشوق کو بادشاہ سے اور مشتاقوں کو لشکر سے تشبیہہ دی ہر وجہ تشبیہہ پہلے میں محبوبیت اور فرماں روائی اور دوسرے میں کثرت اور فرمانبرداری ہی اور حرف رابطہ

دونوں مصرعوں کا کافِ علّت جو دوسرے مصرع کے شروع میں ہے مگر یہ دونوں باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ قابلِ استفسار نہیں یا میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھا اگر ایسا ہو تو پھر تفصیل سے لکھئے اس شعر میں لفظ سودا غلط لکھا گیا ہی صحیح یوں ہے کہ "شادیِ جہاں داری غمِ لشکر نمی ارزد" لفظ غم بھی یہی چاہتا ہو کہ سودا کی جگہ شادی ہو اور اس کو دو طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔ بیو شانی یعنی تم مشتاقوں کی طرف توجہ نہ کرو شادیِ جہاں داری اس قابل نہیں ہو کہ اس کے لئے غمِ لشکر اٹھایا جائے یہ تخویف اس لئے کہ وہ لوگوں کو منہ نہ دکھائے، اور رقیبوں کی کثرت نہ ہو جائے۔ بیو شانی یعنی تم مشتاقوں سے پردہ نہ کرو جہاں داری کے شادی کے مقابلہ میں غمِ لشکر کوئی چیز اور اس کی کچھ حقیقت نہیں، یہ ترغیب اس واسطے کہ وہ جلوہ گر رہے، اور دیدار نصیب ہوا کرے، اس کا علم خدا کو ہے کہ شاعر کا مطلب کیا تھا۔

تقریظ

انشائے بہارِ بیخزاں از مولینا غلام امام شہید

مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوشِ بہارِ معانی ہے! تارِ نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں۔ واہ وا! کلکِ گہربار کی کیا درفشانی ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشا ہی؟ جس کے دیکھنے سے یہ لطف اٹھتا ہے۔ کتاب ہی؟ یا گلزارِ بیخزاں۔ جس صفحہ کو دیکھئے۔ حاشیۂ فردوس کے روشوں پر حاشیہ لکھتا ہی۔ جدول کے خطوں پر سلسبیل اور کوثر کا جی پانی پانی ہوتا ہی۔ سطریں خیابان ہیں۔ الفاظ گلستان ہیں۔ حرفوں کی کششوں پر سرو اور شمشاد کا یقین ہوتا ہی۔ دائروں سے نرگستان آنکھوں کے تلے پھر جاتا ہے۔ حرفوں کی سیاہی سے

کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے۔ گویا درختوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے۔ کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے۔ جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے وہاں قوت نامیہ سے درخت ہر سال پھولتے پھلتے ہیں۔ یہاں فکر دراکہ سے جب دیکھئے فقرات برجستہ سے معانی تازہ نکلتے ہیں۔ مجموعہ ہے۔ یا گنج شایگان۔ ہر باب میں ایسے ایسے بے بہا جواہر حکمت کے بھرے ہیں کہ جسے دیکھ کے جوہری عقل کی عقل چکراتی ہے۔ ہر فصل میں اتنے نقد کامل عیار دانش کے انبار دھرے ہیں۔ کہ مقدار اس کی صیرفی ذہن میں نہیں آتی۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے رکھنے کو حلقۂ چشم درج ہو تو بجا ہے۔ اور یہ وہ نقد ہے۔ جس کے پرکھنے کو سویدائے دل محک ہو۔ تو زیبا ہے شہر علم کے مفلسوں کو صلائے عام ہے۔ کہ اس کی سیر کو آنکھیں کھولیں۔ دامن نگاہ میں موتی رولیں۔ دیار دانش کے ناداروں کو اجازت تام ہے۔ کہ اس گنجینہ کے دیکھنے کو آئیں۔ جتنا حوصلہ ہو۔ اٹھائیں۔ خالی ہاتھ نہ جائیں۔ کتاب ایسی کیوں نہ ہو جب مصنف اس کا وہ ہے جس کی فصاحت نے سحبان کے منہ میں قبر کی مٹی سے خاک بھری۔ اور جس کی جادو بیانی نے سحر بابل کی قدر مٹی کی یعنی فاضل بے بدل۔ عالم عدیم المثل منشی اعجاز نگار۔ شاعر سحر گفتار۔ مولینا غلام امام شہید جن کا ثانی فضل کمال میں نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ تحریر۔ عربی سے ان کی اعشیٰ اور جریر کی پیٹھ قبر میں نہ لگی تھی۔ نثر فارسی سے ظہوری اور طغرا خواب عدم میں چین سے نہ سوئے تھے۔ شعر نے انوری کو بے نور خاقانی کو گدا کر دیا تھا۔ اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا۔ میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا۔ ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی۔ جو یہ تخلص اختیار کیا۔ یعنی در پردہ معذرت چاہی۔ کہ میں تو ہوس کرتا ہوں۔ کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی کچھ ان کی خبر پہنچ گئی تھی۔ کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو منصفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔

آتش نہ مرتا۔ تو کیسا کیسا جلتا؟ ان کی اس نثر نے ریتہ نظم کا کھو دیا۔ استادوں کا سفینہ دریا میں ڈبو دیا۔ سچ تو یوں ہے۔ کہ ان کی حیثیت اور اردو نویسی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس پر بھی اگر تفنن طبیعت کے لئے ادہر کچھ میل کرتے۔ تو ایسی لکھتے۔ کہ ان کی اردو انشا کے سامنے علامی اپنی انشا سے خط غلامی لکھتا۔ بہار دانش کی بہار پر خزاں کا وقت آجاتا۔ سہ نثر ظہوری کو لوگ چھپا ڈالتے۔ طغرا کی تحریر کو خط باطل کی طرح مٹا ڈالتے۔ پر اس سے مجبور ہوئے کہ فرمائش نثر عاری کی تھی۔ گو انہیں اس سے عار تھا۔ پر حکم ماننا ناچار تھا۔ لیکن لوٹ جانے کی جا ہے۔ کہ اس سادگی میں سیکڑوں طرح داری کا مزا بھرا ہے۔ اپنے نزدیک گو کچھ نہ لکھا ہو۔ پر کیسا کچھ لکھا ہے۔ اگر انصاف کیجئے۔ تو ایسی کتاب اردو میں آج تک کوئی نہیں ہوئی۔ اردو کو رتبہ فارسی کا بخشا ہے، اردو نویسوں کو سامان انشا پردازی کا عطا کیا ہے۔ اس کی بدولت ہر ایک اردو نویس اب ایسا منشی یکتا ہے کہ فارسی استادوں کو ان کے آگے سکتا ہے۔ ان میں سے کب کوئی ویسا لکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اردو نویسوں ہی کے حق میں مفید مطلب نہیں ہے ہر ایک قاعدہ اس کا فارسی والوں کے حق میں بھی اکسیر کا نسخہ ہے۔ مصنف نے جو اس کتاب کی تصنیف عاجز کی تکلیف دینے سے اختیار فرمائی۔ میری زبان میں کیا تاب و تواں ہے کہ اس کا شکر ادا کروں۔ یہ تقریظ تو کیا اگر دفتر لکھوں ایک حرف ادا نہ ہو۔ اس لئے دعا پر ختم کرتا ہوں۔ الٰہی! جب تک معنی سخن میں۔ اور سخن حرف میں۔ حرف خط میں۔ اور خط جانِ قالب کتاب میں ہو۔ دانشمندوں کا تعویذ جان اس کتاب کا ہر ایک باب ہو۔ یہ دُعا بجز کی مستجاب ہو۔

نوابِ عبدالعزیز خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر چند یہ دنیا جسے ہم طلسم حیرت کہتے ہیں خود ایسی بیمدار ہے کہ نقش بر آب اس سے زیادہ استوار ہے کسی عبارت سے اس کی بے ثباتی بیان ہو سکے دشوار ہے کسی لفظ سے اس کی تعبیر ہو دور از کار ہے جس وقت ہم اس کی بے بقائی لکھنے کو قلم اٹھاتے ہیں جب تک خامہ ہاتھ سے صفحہ تک پہنچے وہ وقت خود باقی نہیں رہتا پھر لکھا جائے تو کیونکر لکھا جائے جس دم ہم اس کا فانی ہونا بیان کیا چاہتے ہیں، اتنے میں کہ بات دل سے زبان تک وہ گھڑی آپ ہی فنا ہو جاتی ہے کچھ کہا جائے تو کیا کہا جائے جس تماشے کو ہم دیکھ رہے ہیں پلک جھپکی اور وہ بدل گیا جس ہنگامہ کی سیر سے ابھی ہم سیر نہیں ہوئے ہیں نظر پھرتی اور کچھ کا کچھ ہو گیا جو کارخانہ خود ایسا ناپائدار ہو وہاں کون سی شے کسی کی یادگار ہو مگر اس پر بھی اگر کوئی چیز گذشتوں کی یاد دلانے والی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں ان کو دھیان میں لانے والی ہے تو سخن ہے یہی آتش کارواں ہے یہی نقش قدم رفتگاں ہے اسی سے ہمیں کچھ اُن کا پتہ لگتا ہے جو کل مالک وجاہ واملاک تھے اور آج زیر خاک ہیں اسی سے ہمیں کچھ ان کا سراغ ملتا ہے جو کل موجب زینتِ انجمن تھے اور آج باعث ماتم و محن ہیں اسی سے گذرے ہوؤں کا حال ہم پر ایسا واضح ہوتا ہے کہ گویا وہ کہہ رہے ہیں اور ہم اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں، اسی سے آنے والوں کو ہماری کیفیت ایسی روشن ہو گی کہ جیسے ہم ان کے سامنے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ دیوان جس کا ہر مصرعہ چمنستانِ فصاحت کا سروِ چمان ہے جس کی ہر بیت کشورِ بلاغت کا قصرِ فلک نشان ہے بلکہ ہر لفظ معانی نادرہ کی ایک کتاب ہے،

ہر حرف مضامین نایاب کا باب ہی ہر ورق ایک قلزم ہے جس میں غوّاص فکر کو درِ ثمین ملتے ہیں، ہر صفحہ ایک معدن ہی جس سے طرح طرح کے جواہر رنگین نکلتے ہیں اُن کا یادگار ہے جو سلف کے یادگار اور خلف کے افتخار تھے یعنی جامع علوم ماہر فنون انسانِ کامل عزیز ہر دل نواب عبدالعزیز خاں مغفور اللہ اکبر کیسی استعدادِ خداداد ذہن رسا فکر بجا تھی۔ جس کا ادنیٰ نتیجہ یہ دیوان ہے۔ ان کے تبحر علمی کے اعتبار سے جو اُن کی اور تصانیف سے ثابت ہے شاعری اُن کے لئے دون مرتبہ تھی اور ادہر کمتر توجہ فرماتے تھے اُس پر یہ جو کچھ کہا ہے ایسا کہا ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا' اسے دیکھ کے سخن شناسوں کو حیرت ہے کہ جن مضامین تک خاقانی اور انوری کے دستِ فکر نہ پہنچے وہ ان کے ہاتھ کہاں سے آئے اور پھر اس کثرت سے۔ معنی فہموں کو عبرت ہے کہ جن مطالب کی تلاش میں فصحائے عرب و عجم نے جان دی اور ناکام رہے وہ انہیں اس قدر کیوں کر ملے، اور پھر اس ندرت سے اللہ اللہ کل کی بات ہے کہ وہ منتخب روزگار بزم احباب میں باعثِ افتخار علم و فضل میں لوگوں کے مقتدا ہنر اور کمال میں ہر فن کے پیشواؤں کے پیشوا خلق۔ حلم۔ ہمّت۔ مروّت۔ محبت۔ فتوت۔ استقلال۔ استقامت۔ پاس۔ وضع۔ حفظ مراتب میں مشہور عالم۔ ذہن۔ ذکاوت۔ حافظہ۔ عقل۔ فہم۔ دور اندیشی۔ پیش بینی۔ معاملہ فہمی میں محسود بنی آدم تھے۔ آج آفتاب زیر زمیں اور بہشت میں حوروں کے ہمنشیں ہیں۔ وہ تو یہاں بھی اچھے تھے اور وہاں بھی اچھے ہیں افسوس اور رونا تو ہمیں اپنے حال پر ہے کہ وہ دولت ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی اگر لاکھوں برس آسمان چکر کھائے تو اس کا ملنا ممکن نہیں بس بیخبر اس بیان سے زیادہ دل نہ دکھاؤ کبھی اس یادگار کو اپنے زخم جگر کا پھاہا بناؤ اور کبھی اس شعر کو عمل میں لاؤ۔

دل ہمارا ہے مرقع صحبتِ احباب کا — بسر کرکے دو گھڑی جی انہیں بہلالیتے ہیں

دیوان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راستی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا خالق بھی (جس کے حمد سے ہماری زبان الکن، ہمارا بیان بے سروپا، ہماری تقریر ناقص ہمارا کلام نارسا رہے) اس کو پسند کرتا ہی یہ ایک ایسی صفت ہی کہ ممدوحِ خدا بھی جس کے نعت سے ہمارا نطق ابکم ہمارا ذہن عاجز ہماری عقل حیران ہمارا فہم قاصر ہے اس کی مدح فرماتا ہی زبان اور قلم کو خالق اشیا نے وقت خلقت ہی ہیئت میں راست اس لیئے بنایا کہ سخن میں اپنی ہیکل کے موافق راستی اختیار کریں کجی کو عیب جانیں۔ پھر اگر کوئی اسے اپنا شعار کرے تو منصف مزاجوں کو چاہیئے کہ اس کی راست گوئی کی داد دیں، نہ یہ کہ اُسے مبالغہ سمجھیں کیا کوئی خورشید کو روشن بہار کو مشاطۂ شاہد چمن۔ آسمان کو بلند صاحب درہم و دینار کو دولت مند، زمین کو بسیط سمندر کو محیط، مشک کو معطر شمع کو منور پھول کو نازنین قند کو شیریں، گوہر کو آبدار جوہر کو تابدار آئینہ کو مجلّا مصقل کو مصفّے کہے تو کوئی اسے مبالغہ جانے گا نہیں، ہرگز نہیں سب کہیں گے امر حق کا اظہار کرتا ہے جب یہ مسئلہ مسلّم ٹھہرا تو پھر جس کو خداوند کریم نے مالکِ ملک سخن بنایا ہو اگر ہم اس کو یہ کہیں کہ شاعری میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں تو کیا جھوٹ ہے جب دوسرا ایسا پیدا ہی نہ ہوا ہو تو یکتا نہ ہو کیا ہو اگر ہم انھیں یہ سمجھیں کہ سخن سنجی میں خود ہی اپنے عدیل ہیں تو کیوں کر سچ نہیں ہے جب کوئی ایسا وجود ہی میں نہ آیا ہو تو پھر بیمثال نہ ٹھہرے کیا ٹھہرے ان کے کلام میں فصاحت کی کثرت پر نظر کریں تو بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفت جتنی پیدا ہوئی ہے سب انھیں کو دے دی گئی بلاغت کی افراط جب خیال میں لائیں تو بلاشک یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ نعمت جس قدر خلق کی گئی تمام انہیں کے حوالہ ہو گئی۔ اس

قول کو کس وجہ سے یہ خیال کیا جائے کہ تحریر مبالغہ کرتا ہے یا اپنے اتحاد اور ارتباط قدیمی کی پاسداری بناہتا ہے یہی کیوں نہ سمجھا جائے کہ بچے سرے کا راست گو ہے کیسی سچی بات کہتا ہے خصوصاً جب اس صداقت بیان پر اُس کے ایک شاہد عادل اور گواہ صادق موجود ہو وہ کون اس کا دیوان جواب تنگ خلوت خانۂ خفا میں تھا اور اب بمصداق ؎

نکورُو تاب مستوری ندارد　　　چو در بندی سر از روزن بر آرد

بزم اظہار میں آیا ہے یعنی چھپ گیا ہے۔ اب تک مشکل یہ تھی کہ ایسے شاہد زیبا کا نظارہ حاصل ہونا آسان نہ تھا اور اب تو اُس نے اپنے جمالِ جہاں آرا پر سے نقاب اٹھا دیا ہی شہرت کا غازہ چہرہ پر ملا ہے دیدار کے طالبوں کو صلائے عام ہے کہ آویں اُس کی نور آگیں صورت سے آنکھیں روشن کریں اور دیکھیں کہ کیا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ زبان ایسی کہ سلاست اس پر فدا بیان ایسا کہ حسن اس پر شیدا مضامین ایسے بلند کہ عرش سے نیچے ان کا مقام نہیں الفاظ ایسے دل پسند کہ معشوقوں کی طرح ان کے دل رُبا ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ترکیب میں چستی بندش میں درستی مضامین میں جدّت استعاروں میں ندرت ہر بات میں ایک نئی بات ہر نکتہ میں کچھ اور ہی گھات اب تو میرے کہنے کا یقین آئے گا غور سے دیکھو تو یہاں شاہد سخن کا جلوہ ہی کچھ اور ہے اُس نازنین کے اداؤں کا کچھ اور ہی طور ہے ؎

دلربا جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی　　　ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

کرشمہ ہے تو دلربا غمزہ ہے تو روح فرسا عشوہ ہے تو جگر دوز شوخی ہے تو فتنہ آموز ادا ہی تو قیامت زا انداز ہے تو حسرت افزا تبسم ہے تو نمکین تکلم ہے تو شیرین نگاہ ہے تو تیر اشارہ ہے تو شمشیر صفحوں کی سفیدی نہیں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے جس کے سیر سے جی میں سیری نہیں آتی حرفوں کی سیاہی نہیں سرمۂ تسخیر ہے کہ

جہاں نگاہ پڑی پھر وہاں سے اٹھائی نہیں جاتی ہر شعر کو جی چاہتا ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھا کیجیے، ہر مصرعہ ایسا دل میں گڑ جاتا ہے کہ بس اسی کو وردِ صبح و مسا کیجیے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میری یہ دعا ہے کہ خدا سخن فہموں کو اس کے قدر کی دولت عطا کرے اور حاسدوں کے چشم بد سے اسے بچائے۔ فقط

ایک خط

منشی ممتاز علی خاں

جناب ۔ مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالہ کیا ہے، غازی الدین حسین خاں صاحب کے پاس بھیجدیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں مصنف آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجئے، تب چھپوانا شروع کیجئے تو بہتر ہے، فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذات خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے بھٹے لکھوا دیئے ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گورکھپور ۔ لکھنؤ ۔ کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں ۔ اور ان سب کو بھی مجموعہ میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اس کی تصیح کرلی ۔ اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا ۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوالے گا اور جو نقل کے طالب ہوں گے ان کو دے دے گا ۔

تمام شد

نقل عکس تحریر حضرت بجنسہ

عزیز گرامی منشی مرزا قمرالدین صاحب زاد اللہ قدرکم

ہم نے ہر چند قصد کیا کہ میں ان اخباروں اور جنتری کو دیکھوں جن میں حضرت سیدنا امیر ابوالعلا صاحب قدس سرہٗ کے درگاہ عالم پناہ واقع اکبرآباد کی نسبت مضامین اور مباحثے چھپے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجھے اوس کی فرصت نہ ملی اور میں مجبور رہا۔

راقم

فقیر غلام غوث پنشندار میر منشی محکمہ عالیہ گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی و اودھ ملقب بہ خواجہ و مخاطب بہ خطاب خان بہادر ذوالقدر از سرکار دولتمدار انگلشیہ

۷ر جون ۱۸۹۵ء مقام الہ آباد

نوٹ:۔ اصل خط ملک ڈاکٹر مرزا سعیدالدین احمد سجادہ نشین درگاہ امیر ابوالعلا احراری ؒ